بنیادِ تمدّن

از جناب مولٰنا عبد الماجد صاحب دریابادی

فرنگستان کے موجودہ سیاسی مفکرین میں ایک ممتاز نام آکسفرڈ کے جوزف ٹوائنبی کا ہے۔ اجتماعی و تمدنی مباحث پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں، اور قوم ونسل کے علمی مسائل پر ایک ماہر خصوصی سمجھے جاتے ہیں۔ (Encyclopaedia of Religions and Ethics) (ادیان و اخلاقیات کے دائرۃ المعارف) کی ضخیم و مستند مجلدات میں عنوان "نسل" (Race) پر مبسوط مقالہ انہیں کے قلم سے ہے۔ مقالہ کے اندر ہر صاحب فکر کے لیے بہت سی بصیرتیں موجود ہیں۔

وہ کہتے ہیں، کہ قرون وسطیٰ میں جب رومی یا لاطینی کلیسا نے مسیحیت کی منادی شروع کی تو عالم انسانیت کو کل دو حصوں میں تقسیم کیا۔ مسیحی اور غیر مسیحی۔ مسیحی تو وہ جو فی الواقع اور فی الحال مسیحی ہیں، اور غیر مسیحیوں کی تعبیر اس نے یوں کی، کہ بالفعل نہ سہی، بالقوۃ تو یہ بھی مسیحی ہیں۔ یعنی گو اس وقت منکر ہیں۔ لیکن صلاحیت تو بہرحال ان سب میں قبول مسیحیت کی موجود ہے، اور تبلیغ کے اثر سے ان کا مسیحی ہو جانا دائرۂ امکان میں ہے۔ ان کے اور مسیحیوں کے درمیان کوئی ابدی تفریق قائم نہیں، کوئی دائمی ولازوال حجاب نہیں۔ چنانچہ جو جو قومیں مسیحیت قبول کرتی گئیں، اپنے پیش رو مسیحیوں کی معاشرتی واعتقادی زندگی اختیار کرتی گئیں۔ ان کے اور قدیم مسیحیوں کے درمیان کوئی فرق کسی قسم کا قائم نہ ہوا۔

ہوتے ہوتے اصلاح کلیسا کا زمانہ آیا۔ قدیم کیتھولک مذہب، اور پاپائے روم کے خلاف

بغاوت شروع ہوئی، اور مارٹن لوتھر کے اثر سے پروٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا۔ اب اہل یورپ کے فتوحات کا رقبہ وسیع ہوا، اور بحری ترقیوں کی بنا پر ایسی نئی نئی قوموں سے سابقہ پڑنا شروع ہوا، جو اپنی شکل و شمائل میں یورپ اور مغربی ایشیا کے باشندوں سے بالکل مختلف تھیں۔ ان کی جلد کا رنگ، یورپ والوں کے رنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ ان کے تمدن و معاشرت کے ناپنے کے لیے کوئی پیمانہ ہی یورپ میں نہ تھا۔ آب و ہوا ان کے ملکوں کی، یورپ کے ممالک سے بالکل مختلف تھی۔ یہ نیا تجربہ یورپ والوں کے لیے ایسا ہی تھا، جیسا اہل یونان کو اول اول مصر سے سابقہ پڑنے پر پیش آیا تھا۔ لیکن یورپ کے دماغ نے اس سے جو اثر قبول کیا، وہ اس سے بالکل مختلف رہا، جو اہل یونان کے دماغ نے اپنے زمانہ میں قبول کیا تھا۔

یونانیوں نے استدلال یوں کیا تھا، کہ باشندوں میں اگر اس قدر اختلاف ہے، تو خود اُن ملکوں میں بھی تو اسی قدر اختلاف موجود ہے، اور اس لیے انسان کے ظواہر کا یہ سارا اختلاف نتیجہ ہے اختلاف احول کا، ورنہ حقیقت انسانی ہر جگہ یکساں ہے۔ جوں جوں ماحول میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اسی نسبت سے خواص بشری میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے، اور شدید سے شدید اختلافات کے عقب میں بھی بہرحال ایک وحدت کا وجود ہے۔ اہل یورپ پر اس کے برعکس، اپنے نئے سابقہ والوں کی اجنبیت کا دھکا ایسا بیٹھا کہ اس کھلی ہوئی توجیہہ، یعنی اختلاف ماحول کی طرف ان کا ذہن ہی نہ منتقل ہوا، نہ اس امر کی طرف کہ تمدن و معاشرت کے اختلاف کا ہر بڑے سے بڑا منظر بھی بہرحال تدریج ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پس ظواہر کے اختلافات سے وہ ایسے متحیر و مبہوت ہوئے کہ عوارض کو اصل قرار دے لیا، اور ظواہر کو حقیقت کی جگہ پر رکھ دیا۔ ان کے ذہن میں صورت استدلال یوں آئی کہ یہ تو ممکن ہے، حبشی، مسیحی مذہب قبول کرلے، لباس اور معاشرت بھی یورپی اختیار کرلے، لیکن اپنے رنگ کو کیا کرے گا، یہ تو بہرحال اس کے اختیار کی چیز نہیں۔ گورا،

زندگی بھر گورا ہی رہے گا، اور کالا مدۃ العمر کالا۔

یہ اختلاف رنگ کی اہمیت یورپین دماغ پر اس درجہ مسلط ہوی کہ اس کا مطلق کوئی حل اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور رنگ کو گویا مستقل، نوعی، اختلاف کی بنیاد قرار دیکر اُس نے انسانیت کی تقسیم مہذب وغیر مہذب، دو حصوں میں کردی۔ اب نئے نظریہ کے مطابق دنیا کی آبادی مسیحی وغیر مسیحی میں تقسیم نہ رہی۔ بلکہ اب دو صنفیں، گوری قوموں اور کالی قوموں کی قرار پاگئیں جن میں سے ایک کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اپنے ارادہ سے، اپنے اختیار سے، کام لے کر دوسری میں داخل ہوسکے۔ اس تقسیم کے بعد، خود یورپ کی ذہنیت بھی غیر متاثر نہ رہی۔ اور جس طرح یونانیوں کے اس نظریہ کے بعد کہ مصریوں کا مختلف تمدن، مختلف ماحول کا نتیجہ ہے، خود یونانیوں میں قومی عصبیت ہلکی پڑگئی تھی، اور اس کی جگہ نرمی، فراخ دلی، اور رواداری زیادہ پیدا ہوگئی تھی۔ اسی طرح یورپ کی ذہنیت پر، اس گوری اور کالی انسانیت کی ناقابل اتصال وناقابل التیام تفریق کا اثر یہ پڑا، کہ اس کی قومی اور نسلی عصبیت اور زیادہ گہری ہوگئی، اور غیر یورپی قوموں سے اختلاط کا امکان ہی جاتا رہا۔

یہاں تک مقالہ نگار کے مطالب اپنی زبان میں ادا کردے گئے، آگے جو کچھ آرہا ہے، اس کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے، کہ عبارت بھی حتی الامکان، مقالہ نگار ہی کی قائم رہے۔ ترجمہ لفظی اب بھی نہ ہوگا لیکن بہرحال ترجمہ ہوگا۔

"مسیحی دنیا ایک زمانہ میں اپنے اندر جو اندرونی اتحاد اور بیرونی قوت جاذبہ رکھتی تھی، اس کا صحیح اندازہ، موجودہ اسلامی دنیا سے موازنہ کرنے سے ہوسکتا ہے، اسلام (جو مسیحیت ہی کی ایک ادنیٰ درجہ کی نقل ہے، اور نشوونما بھی جس کا بہت دیر میں ہوا) مغربی افریقہ ہو یا ہندوستان، مسیحی مبلغ سے بڑھ کر عملی کامیابی حاصل کرلیتا ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان مبلغ، نومسلموں کو حقیقۃً اپنے طبقہ میں شامل کرلیتا ہے، معاشرت میں ان سے برابری کا برتاؤ کرتا ہے، اور اپنی لڑکیوں کو انھیں بیاہ دیتا ہے۔ اس کے برعکس یورپی مبلغ، اسی تفریق رنگ کی بنا پر "دیسی" مسیحوں سے ویسا ہی اجنبی و بیگانہ رہتا ہے، جیسا کہ غیرمسیحی کافروں سے۔ اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک "دیسی" کلیسا کا انتظام کرسکتا ہے، یورپی آبادی سے بالکل خارج۔

یہ آخری خط کشیدہ فقرے خدا جانے ڈاکٹر امبدکار اور دوسرے اچھوتوں کی نظر سے بھی کبھی گذرے ہیں، جو اپنی پستی اور ذلت کا احساس کرکے ایک نئے دین کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں۔ یاد رہے کہ ابتدائی غیرخط کشیدہ فقروں کی طرح یہ عبارت ایک یورپی مسیحی کے قلم سے ہے جس کا رشتہ اسلام کے ساتھ دوستی کا نہیں دشمنی کا ہے۔

اب آگے جو کچھ ہے، وہ مسلمانوں کے خوش ہونے کے لیے نہیں، عبرت و نصیحت حاصل کرنے اور غور کرنے کے لیے ہے۔

"البتہ یہ ملحوظ رہے کہ جو مسلمان آبادیاں یورپی تمدن کی سطح کے قریب ترین آچکی ہیں، خود وہ بھی اپنی اسلامی (پان اسلامک) اخوت کو ختم کرتی جاتی، اور یورپین طرز کی وہ قومیت اختیار کرتی جاتی ہیں جس کی بنیاد وحدت لسانی پر ہے۔ چنانچہ شام کے عربوں میں اس جذبۂ قومیت کا حاصل یہ نکلا کہ ان کے، اور ایرانیوں اور ترکی زبان بولنے والے مسلمانوں کے درمیان منافرت قائم ہوگئی۔ اور اس نقصان کی تلافی یوں ہوئی کہ عربی زبان بولنے والے مسلمانوں اور مسیحوں کے درمیان منافرت کا حجاب اٹھ گیا۔ ادھر عثمانی ترکوں[1] میں جو قومیت نمو پا رہی ہے۔ وہ خالص افتراقی قسم کی ہے۔ ۱۹۰۸ء کے قبل تک، سلطنت عثمانیہ میں،

[1] واضح رہے کہ مقالہ مصطفیٰ کمال کے دور سے قبل کا لکھا ہوا ہے۔

قرون وسطیٰ کے مسیحی ممالک کی طرح، برسراقتدار وہ طبقہ تھا، جو اپنے میں بلحاظ حقوق، شمار و شامل اپنے ملک کے اُن سارے لوگوں کو کر رہا تھا، جو اس کے ہم مذہب ہوں، خواہ یہ ہم مذہبی ارثاً حاصل ہوئی ہو، یا حال میں بذریعہ تبلیغ۔ نوجوان ترک پارٹی جب برسراقتدار ہوئی، تو اُنہوں نے اس اخوت اسلامی کے بجائے عثمانیت کا پروگرام پیش کیا یعنے اشتراک کی بنیاد بجائے مذہب اسلام کے، ترکی زبان کو قرار دیدیا۔ اور عثمانی حدود ملک سے ان تمام لوگوں کو نکالنا شروع کر دیا۔ جن میں عثمانیت نہ طوعاً پیدا ہو سکی، نہ کرہاً۔ جنگ یورپ کے دوران میں ترکی میں، جو نسلی مقدمات چلے، وہ جس طرح ارمنی مسیحیوں کے خلاف تھے اسی طرح عرب مسلمانوں کے خلاف بھی تھے۔ اور گو ارمنوں کو حسب دستور قدیم اب بھی اسلام قبول کرنے کا موقع دیا جاتا رہا، لیکن اب اسلام قبول کرنے کے بعد ہونے یہ لگا، کہ اگر وہ عورتوں اور بچوں کے محض چند افراد ہوتے تو انہیں ترکی خاندانوں کے حوالہ کر دیا جاتا، اور اگر پورے گاؤں یا قصبوں کی آبادیاں ہوتیں، تو ان کے ساتھ بھی اسی سختی کا برتاؤ رہتا جس طرح اسلام نہ قبول کرنے والوں کے ساتھ۔ یہ پوری پوری آبادیاں اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اپنی زبان قدیم قائم رکھتیں، جیسا کہ بوسینا کے سلافی نسل والے، اپنی علحدہ زبان (جب سے پندرھویں صدی میں سب کے سب مسلمان ہو گئے) اب تک رکھتے چلے آئے ہیں۔ وحدت دینی جو اشتراک معاشری کی بنیاد آبا و اجداد کے وقت سے چلی آتی تھی، اس سے نوجوان ترکوں کو کوئی غرض ہی نہ تھی جب کہ وہ وحدت دینی، اختلاف ظواہر کو نہ مٹا سکے جو جدید اور نازک قومی احساس کے لیے سب سے بڑھ کر تکلیف دہ ہوتا ہے"۔

اس کے بعد مقالہ نگار آخر میں دو سوالات پیش کرتا ہے:۔

"موجودہ احساس قومی کے اس تاریخی ارتقار کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سب سے زیادہ ترقی پذیر مسلم آبادیوں نے آخر اس قومیت کا اثر کیوں اتنا زیادہ قبول کرلیا ہے، جو حقیقۃً ایک تنزلی تحریک ہے؟ اور اگر اس کا سبب تقلید یورپ کو قرار دیا جائے تو پھر یورپ، قرون مظلمہ سے لے کر اب تک کیسے ایسی مسلسل ترقی، اس انحطاط انگیز تحریک کے باوجود، کرتا چلا جارہا ہے؟"[ل]

مقالہ نگار نے جواب جو کچھ دیا ہو، اس سے یہاں غرض نہیں۔ سوال تو آپ کے سوچنے کا ہے۔ کیا آپ کے قرآن نے آپ کو یہ پیام نہیں سنا دیا تھا کہ۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ۔ (نساء ۔ ع ۱) — اے انسانو۔ ڈرتے رہو اپنے پروردگار سے جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔

اور جس نے پھر اسی حقیقت کو یوں ظاہر کیا تھا، کہ

هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (انعام، ع ۱۲) — وہ پروردگار وہی تو ہے، جس نے تم (سب) کو پیدا کردیا ایک ہی شخص سے۔

اور پھر اسی پیام کو یوں یاد دلایا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (اعراف ع ۲۴) — وہ خدا وہی ہے جس نے تم (سب) کو پیدا کیا ایک ہی شخص سے۔

ل ترجمان القرآن: لطف یہ ہے کہ مسلمان تو اسلام سے ہٹ کر نسلی، جغرافی اور لسانی قومیتوں کا سبق سیکھ رہے ہیں۔ اور یورپ میں اب اس قومیت کا آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ آج یورپ میں زبان اور خون اور رنگ کی وحدت کے بجائے ایک مسلک اور ایک تخیل کی وحدت پر قومیت کی بنیادیں رکھی جارہی ہیں۔ ایک طرف اشتراکی نظام کو ماننے والے ایک قوم بن رہے ہیں۔ دوسری طرف فاشزم پر ایمان رکھنے والے ایک دوسری قوم بن رہے ہیں۔ شاید اہل شرق نے قسم کھائی ہے کہ جن جن کڑوے نوالوں کو اہل مغرب تھوکتے جائیں گے انہیں کو یہ لپک لپک کر منہ میں رکھتے جائیں گے۔

اور پھر فرمایا :-

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (زمر ع ۱) پیدا کیا تم (سب) کو ایک ہی جان سے ۔

اور کیا قرآن نے ایک آدھ بار نہیں دس بیس بار "یا ایھا الناس" کا خطاب دوہرا کر یہ حقیقت واضح نہیں کر دی ہے، کہ تمام نوع انسان، اصلاً ایک ہے، وحدت انسانی، اساسی و فطری ہے جغرافی سانی، نسلی، لونی، ساری تقسیمات محض فرعی و ضمنی ہیں۔ اچھے، اور بُرے، کھرے اور کھوٹے جو کچھ ہیں، وہ عقائد و اعمال کی بنا پر ہیں جو تمام تر اپنے اختیار و ارادہ کی چیزیں ہیں، نہ کہ فلاں خاندان میں، فلاں سرزمین پر، فلاں ملک میں، پیدا ہو جانے کی بنا پر، جو انسان کے اپنے ارادہ و اختیار سے تمام تر باہر ہے ؟

اسلام کے قبل دنیا تو مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھی ہی، حد یہ ہے کہ دیوتا اور خدا تک ہر ہر شہر اور ضلع کے دوسری جگہ سے الگ تھے یہود جو موحد تھے، ان تک نے باوجود دعوائے توحید کے خدا کی خدائی کو صرف بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص کر لیا تھا، اور رب موسیٰ گویا صرف رب قوم موسیٰ تھا۔ یہ تخیل تو اسلام ہی نے آکر ہٹایا۔ اسلام ہی نے رب العالمین، کا عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کیا، سب کو وحدت عقیدہ کی طرف بلایا۔ اور دنیا کی تقسیم صرف دو ہی حصوں میں رکھی۔ پیام کو قبول کرنے والے اور نہ قبول کرنے والے۔

خدا کا غضب ہے کہ خود مسلمان ہی اس خدائی تفریق کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، اور پھر اس کی جگہ وہ مشرک قوموں والی دور جاہلیت والی، ذات پات والی، چھوت چھات والی تقسیم قائم کرنا چاہتے ہیں شاندار ناموں کی آڑ میں بڑے بڑے القاب کو سپر بنا کر۔ اور یہ بھی اس وقت جب خود یورپ اپنی نکالی ہوئی راہ سے عاجز آ چلا ہے اور خود اپنے پیروں سے ان بیڑیوں کو کاٹنا چاہ رہا ہے عملاً اسے اس پر قدرت ہو یا نہ ہو، یہ الگ سوال ہے، باقی اس کے سوچنے والے دماغ سوچ تو اب بھی رہے ہیں۔ (ماخوذ از صدق)